فلسفۂ غم

رنج و غم اور کرب و اضطراب کے متعلق غالبؔ نے جو شاعری کی ہے اس کی کیفیت اس نے ایک سادہ سے شعر میں بیان کر دی ہے

؎ رگِ سنگم شرارے می نویسم ‏ ‏ کفِ خاکم غبارے می نویسم

ریشۂ قلم کو رگِ سنگ سمجھ لو۔ جو کچھ لکھتا ہوں وہ الفاظ پاشی نہیں، شرر افشانی ہوتی ہے۔ یا اسے خطِ غبار سمجھ لو۔ بارِ خاطر رفع کرنے کے لیے غبارِ خاطر شعر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن شاعر کے دل سے جو شرر نکلتا ہے، وہ حسن آفرینی کرتا ہے۔ لعل بھی تو آخر پتھر ہی ہے۔ شرارِ سنگ اس میں جمالِ رُخ بن گیا ہے۔ نالۂ غم بال و برق پیدا کرتا ہے۔ ؎

شررے کز نوردِ دل سنگ است ‏ ‏ بر رُخِ لعل جلوۂ رنگ است

دیدہ را جوئے خوں کشادہ تست ‏ ‏ نالہ را بال و برق دادہ تست

غم و الم کے بیان میں غالبؔ کے ہاں دو متضاد خیالات ملیں گے ایک طرف تو وہ غم و اندوہ سے نالاں، زمانے کا بھی شاکی ہے۔ خدا سے بھی گلہ کرتا ہے اور غم سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف وہ غم کو انسان کی روحانی نشوونما کے لیے ضروری خیال کرتا ہے۔ خدا کی حمد میں جا بجا نعمت آفرینی کے شکریے کے بجائے غم آفرینی کا شکر یہ ادا کرتا ہے کہ غم دانش آموز ہے۔ انسان کو حقیقت رس بناتا ہے۔ اور غفلت رفع کرتا ہے۔ اگر غم نہ ہو تو انسان سراپا غفلت بن جائے۔ خوش باشی اور غفلت مرادف ہیں۔

سپاسے ز بسیاریٔ جوشِ دل ‏ ‏ ز اندیشہ ہیوندِ غفلت گسل :

بدانش غم آموزگارِ من است ‏ ‏ خزانِ عزیزان بہارِ من است

احباب جسے خزاں کہتے ہیں وہ میرے لیے بہارِ دانش بن جاتی ہے اور غم جس میں دوزخ کی تپش محسوس ہوتی ہے حقیقت رسی کی وجہ سے میں اسے بہشت تصور کرتا ہوں۔ ؎

غمے کز ازل در سرشتِ من است

بود دوزخ امّا بہشتِ من است

ایک اور جگہ خدا کی حمد میں کہتا ہے

اے نہاں بخش آشکار نواز ‏ ‏ دل بتن تن بجان گرامی ساز

سب انسانوں کی طرح میرا جسم تو مٹی کا ہے لیکن آگ کے عنصر سے تراشا گیا ہے۔ اگر آگ نہ ہوتی تو خالی آب و گل میں روشنی کہاں سے آتی۔ شمع کی طرح یہ آگ جلاتی بھی ہے۔ لیکن نور بھی تو پیدا کرتی ہے۔ انسان کے نفس میں سوز و گداز ہی سے شعور پیدا ہوتا ہے۔ دل کی یہ آگ آتشِ بے دود ہے۔ شعلہ بن کر نمایاں نہیں ہوتی۔ ؎

پیکرم از خاک و دل از آتش است ‏ ‏ روشنیٔ آب و گل از آتش است

آتشم آنست کہ دودیش نیست ‏ ‏ بر نمط شعلہ نمودیش نیست

سوختہ ام لیک نہ سوزندہ ام ‏ ‏ آتشِ بے دود فروزندہ ام

آتشم امّا بفروغ و فراغ ‏ ‏ روشنیٔ شمعم و نورِ چراغ

اقبالؔ نے اسی خیال کو اس شعر میں باندھا ہے۔ ؎

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں

خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

لیکن شاعر کا یہ کام نہیں کہ اپنی افسردگی اور غم زدگی سے دوسروں کو پژمردہ اور اندوہگین کرتا پھرے اگر وہ اپنے فن سے یہ کام لے گا تو دوسروں پر ظلم کرے گا۔ اس کا کام یہ ہے کہ غم کو حُسنِ بیان میں تبدیل کر دے۔ داغ سے لالہ زار اور شرار سے گلزار کی طرح ڈالے معانی کے گلہائے شگفتہ جنتِ نگاہ اور فردوسِ مشام ہوں لیکن جن چنگاریوں سے وہ پھول بنائے ہیں وہ دُوسروں کے دامن پر نہ پڑیں۔ کہتا ہے کہ آفاتِ زمانہ میں تازہ رو رہنے کا فن مجھ سے سیکھو۔ شر کو خیر میں بدلنا اکسیرِ حیات ہے۔

زمن جوی در دبا نکو زیستن
جگر خوردن و تازہ رو زیستن

بعجز از درون سو جگر سوختن
بناز از برون سو رُخ افروختن

بہنگامہ نیرنگ ساز آمدن
زخود رفتن و زود باز آمدن

دل کے کانٹے اپنے نفس کی رہگزار میں ڈالتے جانا لیکن دوسروں کے راستے میں پھول بکھیرنا ؎

زدل خار خارِ غم انگیختن
خسک در گزارِ نفس ریختن

سمن چیدن و در رہ انداختن
دل افشردن و در چہ انداختن

شگفتن ز داغے کہ بر دل بود
نہفتن شرارے کہ در دل بود

میری شاعری کے فنِ لطیف کا خضرِ راہ غم ہی ہے اگر غم نہ ہوتا تو یہ گل افشانیٔ گفتار بھی نہ ہوتی۔ ؎

بدین جادہ کاندیشہ پیمودہ است
غمم خضرِ راہِ سخن بودہ است

کہتا ہے کہ حسبِ روایت نظامی کو خضر علیہ السلام مل گئے تھے جنھوں نے اسے شاعری کا سحرِ حلال سکھا دیا تھا اور زلالی کو خواب میں نظامی سے فیض حاصل ہو گیا تھا۔ لیکن میرا سحرِ بیان تو غم کا آموختہ ہے۔ مجھے کوئی

اور خضر نہیں ملا۔ اور نہ مجھے خواب میں کسی سے فیض حاصل ہُوا۔ مجھے نہ کسی وحی لانے والے روح القدس سے واسطہ پیدا ہُوا۔ اور نہ کسی سروش نے میرے قلب میں مضامین القا کیے۔ میرا خسروانی سرود اور شاہانہ نغمہ میرے ذاتی غم و اندوہ کا عطیہ ہے۔ میں اور کسی کا منت کش نہیں۔

نظامی نیم کز خضر در خیال
بیاموزم آئینِ سحرِ حلال !

زلالی نیم کز نظامی بخواب
بگلزارِ دانش برم جوئے آب

نظامی کشد ناز تا ہم کجا
زلالی بود خفتہ خوابم کجا

مرا بسکہ در من اثر کردہ غم
برگِ طرب مویہ گر کردہ غم

نظامی بحرف از سروش آمدہ
زلالی از و در خروش آمدہ

من از خویشتن با دلِ دردمند
نوائے غزل برکشیدہ بلند

دلِ دردمند نے میری بلند کوشی میں غزل کو اس رتبے پر پہنچا دیا ہے کہ یہ خسروانی سرود وحی بن کر مجھ پر نازل ہوتا ہے۔ سوزِ دل ہی شاعری کو جزوِ پیغمبری بناتا ہے۔ ؎

غزل را چو از من نوائے رسید
ز والا بسیچی بجائے رسید

کہ نشگفت کایں خسروانی سرود
شود وحی و ہم بر من آید فرود

میں نظامی گنجوی نہ ہُوا تو کیا، میرے پاس اس سے کچھ کم گنجِ سخن نہیں اور یہ سب غم کی نغمہ آفرینی ہے ؎

نباشم گر از گنج گنجم بس است
بغم گر چنیں پردہ سنجم بس است

ایک اور جگہ کہتا ہے کہ خالی دانش ایک حکمتِ خنک ہے۔ سوز و گداز کے بغیر حقیقت تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ جس

طرح ہوس عقل کو تباہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح دانشِ سرد سے بھی کام نہیں چلتا جب تک اس میں ایک قسم کے الٰہی جنون کی آمیزش نہ ہو۔ قدم کہیں ٹکنے نہ پائیں اضطراب سے جادہ پیمائی جاری رہے۔ زندگی کی ماہیت تن آسانی اور سکون طلبی نہیں۔ ؎

تن آسانی بتاراجِ بلا دہ — چو بینی رنج خود را رونما دہ
ہوس را سر ببالین فنا نہ — نفس را از دل آتش زیر پا نہ
دل از تابِ بلا بگداز و خوں کن — ز دانش کار نکشاید جنوں کن
نفس تا خود فرو ننشیند از پائے — دمے از جادہ پیمائی میاسائے

عاشقوں اور غازیوں کے جو بلند مراتب ہیں وہ اضطراب اور مصیبت کی بدولت ہیں۔ آسائش طلبوں کو یہ درجے حاصل نہیں ہو سکتے۔

؎ عاشقاں در موقفِ دار و رسن واداشتہ
غازیاں در معرضِ تیغ و سناں انداختہ

غالب خود کوئی بلند مرتبہ عاشقِ الٰہی بھی نہیں اور غازی بھی نہیں۔ کہتا ہے کہ میں نے شمشیر و سناں سے تو جہاد نہیں کیا۔ لیکن اپنے نفس سے ایسی شدید جنگ لڑتا رہا ہوں کہ اگر غازیوں کے سامنے بیان کروں تو لرزے سے ان کی تلواروں کے جوہر گر جائیں۔ اس کے علاوہ مجھے حقیقت طلبی اور اعلانِ حق میں اہلِ دین سے جو اذیتیں پہنچی ہیں اگر دہریوں سے ان کا ذکر کروں تو ان کافروں کو بھی مجھ پر رحم آنے لگے۔ ؎

با غازیاں ز شرحِ غمِ کارزارِ نفس
شمشیر را برعشہ زتن جوہر افگنم

با دہریاں ز شکوۂ بیدادِ اہلِ دیں!
مہرے ز خویشتن بہ دلِ کافر افگنم!

غم کی بصیرت آفرینی کا ذکر جا بجا اور گوناگوں طریق سے کرتا ہے اسے ذاتی وجدان اور تجربے سے یہ یقین حاصل ہے کہ اگر غم نہ ہوتا تو جو بصیرت اسے حاصل ہوئی ہے وہ نہ ہوتی۔ ایک جگہ اپنی ایک حزن و ملال کی شبِ دیجور کا ذکر کرتا ہے جس میں ظلمت اور بے کسی سے اس کا دم گھٹ رہا تھا اور نشاطِ سخن نے بھی اندوہ کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ کہتا ہے ایسی حالت میں میں نے جانِ پاک سے روشنی طلب کی۔ مجھے چراغ مل گیا۔ لیکن ایسا جس کے متعلق میری دعا ہے کہ وہ دوسروں کے گھروں سے دور رہے۔ یہ چراغ بے روغن جس کا شعلہ اپنے آپ پر ماتم کرتا ہے۔ میرا دل ہی تھا جو تابِ غم سے روشن ہو گیا تھا۔ یہی میری تاریک رات کا دیا اور دن کا سورج بن گیا اس دل افروزی کا شکر یہ ادا کرنے کی جگہ میں اس کی شکوہ سنجی کیونکر کر سکتا ہوں۔ ؎

شب از تیرگی اہرمن روئے بود — ز سودا جہاں اہرمن خوے بود
بخلوت ز تار یکیم دم گرفت — نشاطِ سخن صورتِ غم گرفت
دراں کنجِ تار و شب ہولناک — چراغے طلب کردم از جانِ پاک
چراغے کہ باشد ز پروانہ دور — چراغے کہ بادا ز ہر خانہ دور
نہ بینی نشانے ز دود و عن دود — کند شعلہ بر خویش شیون درود
چراغے کہ بے روغن افروختم — دلے بود کز تابِ غم سوختم

زمرواں غم آمد دل افروزِ من چراغِ شب و اخترِ روزِ من
نشاید کہ من شکوہ سنجم ز غم خرد رنجد از من چو رنجم ز غم

غم دل ز من مرحبا جوئے باد
دلم زار و لب مرحبا گوئے باد

غالبؔ کہتا ہے کہ میں قصیدہ خوانی سے بھی کام لیتا ہوں اور حقیقتِ حال بھی اشعار میں بیان کرتا ہوں۔ لیکن ان دو قسموں میں بڑا فرق ہے قصیدہ خوانی میں تو سخن آرائی کی کوشش ہوتی ہے کہ خوبصورت الفاظ اور تصورات کے موتی پروئے جائیں۔ جہاں حق گوئی کا معاملہ ہو وہاں گہر سفتن نہیں بلکہ جگر سفتن سے کام لینا پڑتا ہے۔ اچھا شعر سوز و گدازِ طبع سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی خیال اس نے اُردو میں بھی ادا کیا ہے۔

؎ حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

زشاہاں سخن گر گہر سفتن است سخن گفتن از حق جگر سفتن است
ننالی ز غم گر جگر سفتہ شد سخن ہائے حق بیں کہ چوں گفتہ شد

اسی کیفیت پر اس نے ایک اعلیٰ درجے کی غزل کے مقطع میں بڑے سوز سے روشنی ڈالی ہے کہ اگر شعر کہتے وقت میری حالت اندر سے دیکھ سکو تو تمھیں معلوم ہو کہ آگ کا ایک سیلاب دل سے جگر کی طرف بہ رہا ہے۔ ؎

بینی ام از گدازِ دل در جگر آتشے چو سیل
غالبؔ اگر دمِ سخن رہ بضمیرِ من بری

اس شعر کا مضمون عرفیؔ کے اس شعر سے ملتا ہے۔

؎ بحفظِ گریہ مشغولم اگر بینی درونم را
ز دل تا پردۂ چشمم دو شاخ ارغواں بینی

غم کی کیمیاگری کے متعلق کہتا ہے کہ میں ایک کھوٹا سکّہ تھا۔ غم کے گداز نے مجھے زرِ خوش عیار بنا دیا۔ ؎

دل را بشعلہ جلوہ عطا کرد روزگار
قلبِ من از گداز روا کرد روزگار

جب میں زندگی کے کنوئیں میں ڈول ڈال کر کھینچتا ہوں تو بھاری معلوم ہوتا ہے۔ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ کنوئیں میں یوسف اس کے اندر بیٹھ گیا ہو۔ گرانباریٔ غم ناگاہ عجیب و غریب عطیہ بخش سکتی ہے۔

؎ شگفت کہ یوسف بیاں داشتہ باشد
دلوِ من ازیں چاہ گرانبار برآمد

ایک جگہ غم کے اقسام اور ان کے باہم خلط ملط ہو جانے کی شکایت کی ہے۔ کہتا ہے کہ جو غم دل افروز اور روح کو گوارا ہے وہ ایک بصیرت افزا اور دل پذیر کیفیت ہے۔ لیکن غم روزگار اور ادنیٰ تمنّاؤں سے جو غم پیدا ہوتا ہے وہ تو ایک مذموم شئے ہے۔ اس چرخ ستمگر کو دیکھو کہ سب قسم کے غموں کو ملا جلا دیتا ہے۔ اور جو غم عشق کی شراب ہے اس میں مٹّی ملا دیتا ہے۔ غم عشق کے ساتھ تو نشاط کا پیوند ہوتا ہے۔ باقی غم محض جانکاہ اندوہ ہیں

؎ حاشا کہ ز غم نالم اگر غم غمِ عشق است
پیوندِ نشاط است بدیں زمزمہ دم را
غم کاسۂ سم بود فگندند دراں خاک

واں خاک تبہ کرد گوارائی سم را
ایں چرخ ستمگر کہ چو من غرقہ بخوں باد
بایلد گر آمیخت دو صد گونہ الم را

غمِ عشق کے گوارا ہونے کا تصوّر جا بجا تمام عاشقوں کے بیانات میں ملتا ہے۔ اگر غمِ عشق کربِ محض ہوتا تو کون اس آفت میں پڑتا۔ یا اس میں پڑ کر اسے جاری رکھنا چاہتا۔ حقیقت یہ ہے کہ غمِ عشق کی نفسیات اس قدر سادہ نہیں کہ اس کی کیفیّات کو لذّت یا الم کہ سکیں لذّت اور درد کی سادہ تمیز جسمانی احساسات میں کسی قدر ہو سکتی ہے۔ نفسی تاثّرات میں لذّت اور الم کی ایک نئی آمیزش اور ترکیب ہوتی ہے۔ اور اس مرکّب کو نہ لذّت کہ سکتے ہیں نہ الم۔ موسیقی کی بھی یہی صورت ہے۔ نغمے میں جس قدر درد انگیزی سوز و گداز اور رقّت ہو۔ اسی قدر وہ رُوح کی گہرائیوں کو متاثر کرتا ہے۔ اور رُوح اس سے لذّت اٹھاتی ہے۔ درد سے لذّت اٹھانا ایک متناقض بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن نفسیاتِ انسانی میں یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے اگر غمِ عشق ہے تو بقول غالبؔ اس کے ساتھ نشاط کا پیوند لگا ہُوا ہے۔ اس لیے کوئی عاشق یہ کیفیّت رفع کرنا نہیں چاہتا۔

غالبؔ کہتا ہے کہ اگر میرے ہر رونگٹے میں سے شعلے نکلنے لگیں تو بھی میرا ذوق آتشِ نمرود کی طرح اسے گل و گلستان بنا لے گا۔

ے
آتش چکد ز سر بن مویم اگر بفرض
ذوقم بجود قرارِ گل و گلستاں دہد

گریہ را در دل نشاطے دیگر است
خندہ بر لب ہائے خنداں مے زنم

ایک تشبیب میں مصیبت زدگی کے باوجود اپنی خوش طبعی اور کشادہ روئی کی نفسیات بڑی عمدگی سے بیان کی ہیں۔ کہتا ہے۔ کہ مصائب کی گرفتاری دل کی گہرائیوں میں شادمانی کی کیفیّت فنا نہیں کر دیتی۔ دل کی عام شاہراہ کے پیچھے ایک پس کوچہ بھی ہے جہاں ظاہری گرفتاری اور پریشانی کے باوجود دل کشادہ رو ہی رہتا ہے۔

ے
مرا وے ست بہ پس کوچۂ گرفتاری
کشادہ روئے تر از شاہدان بازاری

عاشق کی جسمانی لاغری روحانی فیض یابی میں معاون ہی ہوتی ہے اگر دھاگا زیادہ موٹا اور گرہ دار نہ ہو تو اس میں موتی آسانی سے پروئے جا سکتے ہیں۔ ے

بہ لاغری کنم آساں قبول فیض سخن
کہ رشتہ زود رباید گہر ز ہمواری

محض لذّت طلب لوگوں کے انبساطی نغموں میں وہ گہرائی نہیں ہوتی جو جگر خواری سے پیدا ہونے والے زمزمے میں ہوتی ہے۔ میں طوطیٔ شکر خا نہیں بلکہ جگر خوار ہوں۔ اعلیٰ درجے کی شاعری خونِ جگر ہی کی نمود ہوتی ہے۔ ے

ز طوطیانِ شکر خا مگوی وا ز من جوی
نشاطِ زمزمہ و لذّتِ جگر خواری

جس طرح زلف کی پریشانی میں ایک خاص قسم کا حُسن ہوتا ہے

اسی طرح میری شمشیرِ سخن کے جوہروں میں بھی پریشانی جمال آفرینی کرتی ہے۔ عاشقِ بیمار بھی معشوق کی چشمِ بیمار کی طرح مستِ حسن ہوتا ہے۔ ؎

چو زلف جوہرِ تیغم بود پریشانی
چو چشمِ ناز بخویشم رسد ز بیماری

بعض اشعار میں یہ مضمون بیان کیا ہے کہ غم سے اخلاقی تربیت بھی ہوتی ہے اور انسان سلامت روی کی طرف آتا ہے۔ مثال یہ دیتا ہے کہ اگر گھوڑے پر بوجھ لدا ہوا ہو تو اس کی بے طرح اچھل کود اور دولتیاں بند ہو جاتی ہیں۔ غم بھی عشق کی طرح طبیعت کے بل نکال کر ہموار کر دیتا ہے۔ ؎

غم است آنکہ منش راہی کند ہموار   رود ز اسپ بروں توسنی چو بار شدہ

زمانے کی سختی سان کے پتھر کی سی سختی ہے جس کا مقصد یہی ہے کہ تیغِ حیات کو اس پر تیز کیا جائے۔ یہ سختی نہ ہو تو دمِ شمشیر کند ہو جائے۔ آسمان کی درشت خوئی کی شکایت کرنا بیجا ہے۔ ؎

تیزیٔ فکر من از تست ز گردوں چہ خطر
سختیٔ دہر شود تیغِ مرا سنگِ فساں

غالب کا ایک دل پسند مضمون یہ ہے کہ دنیا میں اہلِ دل اور اہلِ معنی پر زیادہ مصیبت کیوں آتی ہے۔ اس کے لیے وہ بے شمار توجیہات پیدا کرتا ہے۔ بعض توجیہات اوپر بیان ہو چکی ہیں کہ فطرت جس میں بصیرت پیدا کرنا چاہتی ہے اس کی زندگی کو کچھ غم اور مصیبت سے دوچار کرتی ہے۔ آتش زیرپا ہونے ہی سے ہستی کے اسرار فاش ہوتے ہیں اور سوز و گداز ہی کی بدولت انسان حقیقت آشنا ہوتا ہے۔ ان توجیہات

میں کبھی کبھی شوخی اور بذلہ سنجی سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ جب بخیل اپنا خزانہ محفوظ کرنا چاہتا ہے تو اسے لوہے کے صندوقوں میں بھاری بھاری قفل لگا کر رکھتا ہے۔ اہلِ معنی گنجینۂ حیات ہیں اسی لیے ان پر فلک کی طرف سے شدید پابندی اور سختی ہوتی ہے۔ ؎

اہلِ معنی را نگہدارد بسختی آسماں
سفلہ را بر گنجِ زر بینی کہ بندِ آہن است

پھر ذرا مضمون کو بدل کر کہتا ہے کہ فلک جو لئیمی اور بخیلی میں بدنام ہو گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا خزانہ میں ہی تھا۔ یہ مسکین مجھے کہیں چھپا کر بھول گیا اور اس نسیان کی وجہ سے تہی دست ہو گیا۔ ؎

در لئیمی شہرۂ دہر از تہی دستی است چرخ
رفتہ مسکین را ز یادہ گنجِ پنہانش منم!

حسد کے اشعار میں کہتا ہے۔ خدا دوستوں کو اس لیے امتحان میں مبتلا کرتا ہے کہ ان پر دشمنوں کی چشمِ حسد اور نظرِ بد نہ پڑنے پائے۔ ؎

تا دریں صورت ز چشمِ دشمناں پنہاں بود
دوست را اندر طلسمِ امتحاں انداختہ

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جن دوستوں کی وہ اچھی طرح مہمانی کرنی چاہتا ہے۔ ان کے لیے میزبان کے گھر تک پہنچنے کے راستے میں کانٹے بچھا دیے جاتے ہیں تاکہ منزل پر پہنچ کر خستگی کے علاج سے مزید راحت حاصل ہو۔ ؎

تا علاجِ خستگی آسائش دیگر دہد
خارہا در رہگذارِ میہماں انداختہ !

عقلِ کُل سے پوچھتا ہے کہ مجھے عمر قید کی یہ سزا کس جُرم میں ملی ؟ وہ جواب دیتی ہے کہ بدبخت ! تجھے اپنے کمال کا احساس نہیں ، دیکھتا نہیں کہ چیلوں اور کوّوں کو تو لوگ پکڑ کر چھوڑ دیتے ہیں ۔ لیکن اگر بُلبل جال میں آجائے تو اس کے نغمے سُننے کے لیے اسے پنجرے میں بند کر دیا جاتا ہے ؟ کون چاہے گا کہ پنجرے کی کھڑکی کھول کر بُلبل کو اُڑا دے ؟ ؎

گفتم بہ عقلِ کُل کہ ندانم برائے من !
حکم دوام حبس چرا کرد روزگار !
گفت اے ستارہ سوختہ زاغ و زغن نۂ
کانرا گرفت و باز رہا کرد روزگار !
تو بلبلی ہمیں کہ بدام آمدی ۔ ترا !
اندر قفس زبہرِ نوا کرد روزگار !

جس طرح خدا تک پہنچنے کے راستے میں قصداً مشکلات پیدا کی گئی ہیں تاکہ امتحان کے بعد اہلِ ہوس اور اہلِ عشق میں امتیاز پیدا ہو سکے ، اسی طرح خانہ کعبہ کے گرد بھی بیابان بنا دیا گیا ہے کہ دُور دُور تک کہیں پانی نہ ملے اور معلوم ہو سکے کہ کون یہ دشوار گزار راستہ طے کرنے پر آمادہ ہوتا ہے جس میں نہ دریا ہے نہ ندی نہ نالا ۔ ؎

عیارِ کعبہ رواں تابہ تشنگی گیرند
نداده اندر آں دشت راہ دریا را

مندرجۂ صدر اشعار سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ جس طرح عشق کی اصطلاح متعدد اور بارہا متضاد معنی میں استعمال کی جاتی ہے ۔ اسی طرح غم کا لفظ بھی کثیر الانواع معانی کا حامل ہے ۔ شعر کے مضمون اور موضوع سے

اندازہ کرنا پڑتا ہے ۔ کہ یہاں غم سے کس قسم کا غم مراد ہے ۔ عشقِ مجازی کا غم بھی غم ہے اور عشقِ حقیقی کا غم بھی غم ۔ دونوں جگہ عشق کا لفظ بھی مشترک ہے اور غم کا لفظ بھی ۔ لیکن معنی میں بعد المشرقین ہے ۔ ایک صُوفی شاعر نصیحت کرتا ہے کہ ؎

عشقِ حقیقی ست مجازی مگیر   این دُمِ شیر است ببازی مگیر

اسی طرح ایک رومی جیسا برگزیدہ عارف شباب میں پیدا ہونے والے بہیمی عشق کی بابت کہتا ہے کہ دیکھنا کہیں اسے عشق نہ سمجھ لینا ۔ یہ تو خوراک سے یا شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے سے پیدا ہوتا ہے ۔ ؎

ایں نہ عشق است ایں کہ در مردم بود
ایں فساد از خوردن گندم بود

اسی طرح غم کی کیفیت ہے ۔ اوپر غالبؔ کے وہ اشعار درج ہو چکے ہیں جن میں اس نے بجا شکایت کی ہے کہ اس فلکِ بد اختر نے تمام قسم کے غم خلط ملط کر کے اس سمِ غم کے ساغر میں بھی مٹی ڈال دی ہے جو خالص ہوتا تو آبِ حیات ہوتا ۔ غالبؔ کے اشعار میں سب قسم کے غم ملتے ہیں ۔ اس عشق کا غم بھی ہے ۔ جسے مادی اور جسمانی سود و زیاں سے کوئی تعلق نہیں ۔ ساتھ ہی معمولی آرزوؤں اور ہوسوں کے پُورے نہ ہونے کا غم بھی ہے ۔ ناقدریٔ عالم کی شکایت بھی ہے ۔ ہر قسم کے غم ۔ عشق اور غمِ روزگار کی آمیزش بھی ہے ۔

؎ غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

غالبؔ کا خیال ہے کہ زندگی کسی نہ کسی قسم کے غم اور اضطراب

ہی کا نام ہے۔ اور اگر ہر قسم کے اضطراب سے بچنا چاہیں تو افسردگی کا خطرہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے اضطراب کے مقابلے میں افسردگی سے زیادہ ڈر لگتا ہے۔ زندگی کی رونق ایک ہنگامے پر موقوف ہے نغمۂ شادی نہ ہو تو نالۂ غم ہی سہی۔ محبت نہ ہو تو عداوت ہی سہی۔ غم اگرچہ شمع کی طرح جانگداز ہوتا ہے۔ لیکن نورِ حیات بھی پیدا کرتا ہے شمع نہ جلے تو اس میں یہ فائدہ تو ضرور ہوگا کہ وہ جوں کی توں باقی رہے گی۔ لیکن اس طرح باقی رہنے میں کیا مزہ ہے۔ زندہ ہو کر باقی رہنا چاہیے۔ لیکن یہ سوز و گداز اور اضطراب کے بغیر ممکن نہیں۔ شمعِ کُشتہ کی بقا کوئی قابلِ تمنّا چیز نہیں۔

ع

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے مجھے
ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کُشتہ ہے

کسی لطیف اضطراب کی تعریف میں لکھتا ہے کہ اس کی جنبش میں تو گہوارے کا سا لطف آتا ہے۔ اس کیفیّت میں ہر قسم کے فکر و اندیشہ سے فراغت رہتی ہے۔ ع

با اضطرابِ دل ز ہر اندیشہ فارغم
آسائشے ست جنبشِ ایں گاہوارہ را

ایک اور شعر میں آسودہ طبع لوگوں کے سینے کو زمہریر کہتا ہے اور اس کیفیت سے بچنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ع

حذر از زمہریرِ سینۂ آسودگاں غالبؔ
چہ منتہا کہ بدل نیست جانِ ناشکیبا را

جب طبیعت میں کسی قسم کی تمنّا کا ہیجان محسوس نہیں ہوتا تو اسے ڈر آنے لگتا ہے کہ دِل کہیں مُردہ تو نہیں ہو گیا۔ فوراً شوق کو دعوت دینے لگتا ہے

کہ آ ایک بھڑکتی ہوئی آہ ہی نکال کہ نفس میں کچھ حرکت تو محسوس ہو۔

ع

غمِ افسردگیم سوخت کجائی اے شوق
نفسم را بہ پر افشانیٔ آہے دریاب

جیسا کہ اُوپر متعدد اشعار میں بیان ہو چکا ہے وہ خُدا کی تعریف اکثر آفرینشِ غم کی وجہ سے کرتا ہے۔ دُنیا کی نعمتوں کو شمار کر کے خُدا کا اس قدر شکر گزار نہیں ہوتا جتنا کہ غم آفرینی کے باعث ہوتا ہے۔ غمِ عشق ہی کو نعمت سمجھتا اور اس پہ دل سے خوشی کا اظہار کرتا ہے۔

ع

اے کہ بدیدہ نم زتست وے کہ بسینہ غم زتست
بارِشِ غم کہ ہم زتست خاطرِ شاد مے دہد

اس کے ساتھ ہی دُوسرے شعر میں کہتا ہے کہ جب غم انسان کو پھٹکتا ہے تو دانے الگ ہو کر خرمن بن جاتے ہیں اور بھوسا اُڑ جاتا ہے زندگی کی کشاکش کا مقصد ہی بقائے اصلح ہے کہ پیکارِ حیات میں ادنیٰ معدوم ہو جائے اور اعلیٰ باقی رہے۔ غم ہی زندگی کا یہ مقصدِ اصلی پُورا کرتا ہے۔

ع

غم کہ بہم ورا فگند رو کہ مراد مے دہد!
دانہ ذخیرہ مے کند کاہ بباد مے دہد

ورزشِ ارتقا کی ایک کیفیّت ہے ہر ترقّی کا قدم اٹھاتے ہوئے اور ہر انقلاب کی ابتدائی منزل میں انسان گھبرانے لگتا ہے۔ کم ہمت لوگ ڈر کر پیچھے ہٹ جاتے اور اسی میں سلامتی سمجھتے ہیں۔ لیکن اس پہلی منزل میں اگر دل کو قوی رکھیں اور یاس یا خوف سے مغلوب نہ ہوں تو دُوسری منزل کے شروع ہی میں کامیابی کی بھینی بھینی خوشبو مزید جادہ پیمائی کے لیے زادِ راہ بن جاتی ہے اور جیسے جیسے کامیابی کے قریب پہنچتے جائیں سفر خوشگوار

ہوتا جاتا ہے۔اس مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

؎ آخر منزلِ نخست غوئے تو راہ می زند
اوّل منزل وگر بوئے تو زادِ مے دہد

ایک وہ کیفیت ہے جسے عام معنی میں غم یا اضطراب نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ وہ روشنیٔ طبع کی بلاخیزی اور شوخیٔ اندیشہ کا پیچ و تاب ہوتا ہے سُست فکر اور جامد طبیعتیں اس کشاکش سے آشنا نہیں ہوتیں۔ خود اپنی طبیعت کا حال بیان کرتا ہے۔ ؎

شوخیٔ اندیشۂ خویش است سرتا پائے ما!
تار و پودِ ہستی ما پیچ و تابے بیش نیست

کہتا ہے کہ ہماری طبیعت کا تانا بانا اسی پیچ و تاب سے بنا ہُوا ہے

غالب کے بعض نقادوں نے اس پر بہت بحث کی ہے۔ کہ غالبؔ رجائی تھا یا قنوطی۔ اس کے کلام میں آس غالب ہے یا یاس۔ زندگی کو سراپا الم خیز سمجھتا ہے یا امید کی جھلک بھی اس میں نظر آتی ہے۔ زندگی کی آرزوؤں کو لاحاصل سمجھ کر ترک کرنا ہی بہتر سمجھتا ہے یا ان سے لُطف اُٹھانے کا بھی آرزومند ہے۔ غم ہی کو زندگی کا حاصل قرار دیتا ہے۔ یا اسے حقیقی راحت کا وسیلہ گردانتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص زندگی کو حرکت اور اضطراب جانتے ہُوئے بھی اس کا ستائش گر ہے۔ اسے قنوطی کیونکر کہہ سکتے ہیں اور ایسا شخص زندگی کو بُرا کس طرح کہہ سکتا ہے جو اس کی تمام جائز اور ناجائز خواہشوں کو پُورا کرنا چاہتا ہے اور جو پوری نہیں ہو سکتیں ان کی حسرت دِل میں لیے ہوئے آخرت کو سدھارتا ہے اور وہاں خدا سے شکایت کرتا ہے کہ اگر تو کردہ گناہوں کی سزا دینا چاہتا ہے تو ناکردہ گناہوں کی حسرت بھی ترازو کے

دُوسرے پلڑے میں رکھ کر تول لے۔ حسرتوں کا وزن کردہ گناہوں سے کچھ بھاری ہی نکلے گا۔ اس کے اکثر اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غم کو بصیرت افروز اور انجام کار راحت افزا سمجھتا ہے۔ اسے ایک طریقِ تربیت اور اسلوب امتحان تصوّر کرتا ہے۔ فطرت جن کو جلد ترقی دے کر منزل تک پہنچانا چاہتی ہے ایسے بلند ہمتوں ہی کو غم کی وادی سے گزارا جاتا ہے۔ یہ تیز گام اس غم کی بدولت نفسِ مطمئنہ کے مقامِ محمود تک پہنچ جاتے ہیں۔

؎ قضا در کارہا اندازۂ ہر کس نگہ دارد
بقطعِ وادیٔ غم مے گمارد تیز گامان را

فطرت جو رنج پہنچاتی ہے اسے اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کا اصل مقصد راحت رسانی ہوتا ہے۔ جرّاح کی نشتر زنی ہو یا پائے شکستہ کو جکڑنے کی تکلیف غایت تو حصولِ راحت ہی ہے

؎ بہ رنج از پئے راحت نگاہ داشتہ اند!
زحکمت است کہ پائے شکستہ در بند است

طالب حق کی طلب صادق ہی میں مطلوب موجود ہوتا ہے۔ اگر مطلُوب خود اس طلب میں کسی انداز سے موجود نہ ہو تو طلب کی یہ کیفیت بھی نہ ہو صوفیہ کہتے ہیں کہ طالب حق کا طالب خود حق ہوتا ہے اور طالب کی طلب میں وہ خود موجود ہوتا ہے۔ غالبؔ کہتا ہے کہ اس طلب میں دردِ فراق سے زار نالی کرنے والا شخص نا اہل ہے۔ اسے یہ احساس نہیں کہ دردِ فراق میں خود مطلوب اس کا ہم نوا ہے۔

؎ چہ نا کسی کہ ز دردِ فراق مے نالی!
نمی رسی کہ دریں پردہ ہم نوائے تو کیست

غم ہی زندگی کی تمام گرہوں کو گداز کرکے کھول دیتا ہے۔ مقصود پر جہاں جہاں قفل لگے ہوئے ہیں انھیں کھولنے کی کنجی بھی ہے ؎

کلیدِ بستگی نیست غم۔ بجوش اے دل
تو گر چنیں نگدازی گرہ کشائے تو کیست

زندگی کے قفل کھولنے کے متعلق ایک اور استاد کا شعر کس قدر لطیف اور بلیغ ہے ؎

در فیض است منشیں از کشائش ناامید ایں جا
برنگِ دانہ از ہر قفل مے روید کلید ایں جا

مشکل سے مشکل حالات میں بھی کشودِ کار سے ناامید نہ ہونا چاہیے دیکھو دانے کا قفل کس طرح اس کے اندر ہی سے کنجی لگ کر کھلتا ہے۔ اور کسی قسم کے غم سے پریشان ہونے کی اس لیے بھی کوئی وجہ نہیں کہ عیش ہو یا غم یہ تغیر پذیر کیفیتیں ہیں۔ بقول حافظ ؎

بیار بادہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند
چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

غالب کہتا ہے کہ اگر نفس آزاد ہو تو وہ چھلنی کی طرح ہوتا ہے اس میں جو کچھ ڈالو چند لمحوں میں ٹپک کر غائب ہو جاتا ہے۔ بادۂ عیش ہو یا خونابۂ غم اس میں ٹکنے نہیں پاتے۔ ؎

عیش و غم در دل نمی اِستد خوشا آزادگی
بادہ و خونابہ یکسانست در غربالِ ما

ایک جگہ جگر سوختہ اہلِ دل کو طویل ارتقائے حیات کا ماحصل قرار دیتا ہے۔

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ
چوں من از دودۂ آذر نفساں برخیزد

یہ مضمون اقبال کے نظریۂ ارتقاء کے بہت مطابق ہے۔ ؎

شعلۂ عشقش صد ابراہیمؑ سوخت!
تا چراغِ یک محمدؐ بر فروخت

؎ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جس آنکھ میں نمی نہیں وہ سرابِ دشت سے بھی بدتر ہے۔ ؎

سرابے کہ رخشند بویرانہ خوشتر
ز چشمے کہ پیرایۂ نم ندارد

کسی بلند مقصد کے حصول میں جو طالب گرم رَو ہوتے ہیں ان کی جادہ پیمائی کی وجہ سے بعد میں آنے والوں کے لیے راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ اور بعض مشکلات جو پیش رووں کو پیش آئی تھیں وہ ان سے بچ جاتے ہیں۔ غالب اس مضمون کو ایک عمدہ تشبیہ میں بیان کرتا ہے کہ مجھ ایسے آتش زیر پا جادہ پیما کی گرم روی سے راستے کے کانٹے جل جاتے ہیں۔ بعد میں آنے والے راہرووں پر میرا یہ احسان ہے۔ اگر اس مضمون کو فنِ شعر پر بھی عائد کیا جائے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر قادر الکلام شاعر بعد میں آنے والوں کے لیے کسی قدر راستے صاف کر جاتا ہے۔ ؎

خارہا از اثرِ گرمیٔ رفتارم سوخت
منتے بر قدمِ راہرواں ہست مرا